UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222435

UNIVERSAL
LIBRARY

TIGHT BINDING BOOK

OUP—391—29-4-72—10,000.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. [illegible] Accession No. [illegible]

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

قندیل

قیوم نظر

ناشر

کتاب خانہ پنجاب لاہور

بار اول   جون ۴۵ء   قیمت عہ

واحد نمائندہ

اردو بک سٹال بیرون لوہاری دروازہ
لاہور

"حلقۂ اربابِ ذوق" کی مخلصانہ تنقید کے نام

ایم۔ظہیر پرنٹر و پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور سے چھپوا کر کتاب خانہ پنجاب لاہور سے شائع کی۔

فہرست

ابتدائیہ	۷	غزل	۴۱
نیا سال	۱۱	ستون آوارہ	۴۳
رنگِ وحدت	۱۳	غزل	۴۶
غزل	۱۶	داشتنہ	۴۷
ناچ	۱۸	غزل	۵۰
غزل	۲۱	ترغیب	۵۲
عشقِ گریزاں	۲۳	غزل	۵۴
برسات کی رات	۲۶	محرومی	۵۶
غزل	۲۸	واپسی	۵۸
مجبوری	۳۰	غزل	۶۱
غزل	۳۳	خلشِ تاثر	۶۲
اس بازار میں ایک شام	۳۵	انجام	۶۶
خوابِ گراں	۳۷	تھکن	۶۹

غزل ۷۱
بے بسی ۷۳
خزاں ۷۵
مآل ۷۷
غزل ۷۹
زندگی ۸۱
غزل ۸۳
نورجہاں کا مزار ۸۵
اپنی کہانی ۸۷
نئی تحریکیں ۹۰
جنگ ۹۳
جوانی ۹۵
غزل ۹۷
شبخون ۹۹
غزل ۱۰۳
بنی آدم ۱۰۵
آندھی ۱۰۷
شام ۱۰۹
صبح کاذب ۱۱۱
الجھن ۱۱۳
غزل ۱۱۶
ساقی نامہ ۱۱۸

ابتدائیہ

اپنی نظموں کے متعلق مجھے کچھ زیادہ غلط فہمی نہیں لیکن یہ خیال کہ ان میں سے شاید چند ایک بھی کچھ مدت تک زندہ نہ رہ سکیں گی مجھے ان کے بارے میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ نفسیات کے گورکھ دھندوں میں الجھانے والے جو چاہیں کہیں لیکن اس ضمن میں مجھے اپنے طور پر بعض داخلی اور خارجی باتیں کافی وزن دار معلوم ہوتی ہیں۔ اس قسم کی داخلی باتیں کہ زندگی کے متعلق میرا نظریہ چنداں امید افزا نہیں یا یہ کہ میرے رگ و پے میں یاسیت گھر کر چکی ہے، ایسی چیزیں ہیں جن کے بارے میں مجھ سے زیادہ میرے دوستوں کو کچھ کہنے سننے کا حق حاصل ہے۔ اس لئے کہ اس رنگ میں وہ مجھ سے زیادہ مجھ کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ البتہ بعض خارجی وجوہات ایسی ہیں جن کے ذکر سے ان نظموں کے پس منظر پر روشنی پڑ سکتی ہے۔

خارجی باتوں پر گفتگو کرنا میرے لئے اس وجہ سے بھی ضروری ہے

کہ میں اپنے گرد و پیش سے بہت متاثر ہوتا ہوں اور بنی آدم کی بیشتر بوالعجبیاں یا قدرت کے اکثر مظاہر مجھے اپنی دنیا میں گم کر کے مجھ پر داخلی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ گو اس سلسلے کے ہر گوشہ کی عکاسی میرے بس کا روگ نہیں چنانچہ ہو سکتا ہے کہ ان نظموں میں ملکی جھگڑے، سیاسی نظریے، سماجی الجھنیں اقتصادی مسائل اور وقت کے اور بہت سی الجھنوں کے تار و پود بکھرتے ہوئے بظاہر نظر نہ آئیں لیکن اس کا یہ مطلب نہ ہوگا کہ میں دنیائے رنگ و بو میں کھو کر زندگی کی دوڑ میں ان باتوں سے بے خبر رہا ہوں۔ میرے نزدیک ان نظموں کی جان و ماحصل یہی چیزیں ہیں اور ان نظموں کی رگ رگ میں اگر ان چیزوں کا خون رواں دواں نہیں تو کم از کم موجود ضرور ہے۔

پچھلے دس سال میں جس تیزی بلکہ باد پائی سے شاعروں کے ایک گروہ نے دوسرے گروہ کو جا لیا ہے۔ وہ اس محشر خیز جنگ کے زمانے میں بھی حیران کن ہے۔ پھر صرف یہی نہیں ہر شاعر نے اپنے خاص رنگ میں اپنی افتادِ طبع کے جوہر کچھ اس طرح دکھائے ہیں کہ سست گام رہروؤں کے لئے نکتہ چینی کے کتنے ہی سامان پیدا ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کیلئے میرے خیال میں ہماری کوششوں کے سراہے جانے کی اتنی ہی گنجائش ہے جس قدر ہم سے برہم ہونے کی۔ کیونکہ ہماری اس طوفانی رفتار کی ذمہ دار ہم سے کہیں زیادہ ہر آن بدلتی اور ہر قدم پر اپنی پریشانی میں اضافہ کرتی ہوئی ہماری صدیوں کی پرانی دنیا ہے۔ یہی دنیا جس سے کم از کم میں ایک لمحہ کے لئے بھی الگ نہیں ہو سکا۔ چنانچہ ان نظموں کے خارجی اور داخلی عناصر میں اگر جدید اور قدیم کا امتزاج پایا جاتا ہے تو اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے۔

جدید شعری کارناموں میں نظم آزاد کو کافی کوسا جا چکا ہے۔ نظم آزاد اگرچہ چند صورتوں میں ہماری بعض ضرورتوں کے لئے لابدی ہے۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اس کی بیشتر حیثیت ابھی ایک طویل تجربہ کی سی ہے۔

مشتثنیات سے قطع نظر پرانے لکھنے والے نت نئے تجربوں کی دنیا میں اپنے آپ کو اس لئے نمایاں نہ کر سکے کہ ان کے وقت کا تقاضا اس سے مختلف تھا۔ ان دنوں زمانے کو اس قدر جلد کروٹیں بدلنے کا شعور نہ آیا تھا اور عافیت پسند ہونے کے باعث ان لوگوں کو ایک ہی روش بلکہ اپنی پرانی ہی ڈگر پر چلنے میں سہولت نظر آتی تھی۔ اس کے برعکس آج کل کے شعراء کے لئے شعر میں تجربہ کوئی بڑی یا خوفناک بات نہیں چنانچہ اس پوری طرح سے گرفت میں نہ آنے والے دور میں اکثر شعرا کچھ تجربے کر رہے ہیں۔ ان میں ہر شاعر نظم آزاد نہیں لکھتا۔ لیکن اپنے نظریئے کے مطابق مختلف طریقوں سے اپنی بات کہتا اور نئے تجربوں کی داغ بیل ڈالتا چلا جاتا ہے۔ میری بیشتر نظمیں ضمنی طور پر چند ایسے ہی تجربوں کی حامل ہیں ان میں اکثر وقتاً میں نے اپنے نہایت قریب کے پیشروؤں یا ہمعصروں کے تجربات سے فائدہ اٹھایا ہے مگر بعض جگہ شاید بالغ نظر آنے والوں کیلئے ننگِ منزل نما چھوڑ جانے کی ہلکی ہلکی کوششیں بھی کی ہیں۔

ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے میں اپنی نظموں کو اس صنف میں جسے عرفِ عام میں نئی شاعری کہتے ہیں شمار کرتے ہوئے کترا تا بلکہ ڈرتا ہوں نئی شاعری کیا ہے؟ یا نئی شاعری کے اجزا کیا ہیں؟ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب بآسانی نہیں دیا جا سکتا۔ دراصل نئی شاعری کی حمایت میں کچھ کہنے والوں نے اس سلسلے میں ایسی گرہیں ڈال دی ہیں جن کو کھولنے کیلئے ہمیں اب دل سے زیادہ دماغ سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ نئی شاعری کی تعریف نہ تو ان تحریکوں کو بے نقاب کرنے سے ہو سکتی ہے جن کے تحت مختلف شعرا نظمیں لکھ رہے ہیں

اور نہ ان تاثرات کی چھان پھٹک ہی سے اس کے اجزا ڈھونڈے جا سکتے ہیں جن کی آغوش میں آج تمام دنیا چلی جا رہی ہے۔ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں ہر نیا شاعر آزاد یا معرا نظم نہیں لکھتا۔ ہر نیا شاعر مزدور اور سرمایہ دار کے جھگڑے بھی نہیں چکاتا۔ بلکہ ہر نیا شاعر سیاسیات، جنسیات، نفسیات وغیرہ میں بھی گم نظر نہیں آتا۔ درحقیقت ہر نئے شاعر نے اپنی ایک دنیا الگ ہی بسائی ہے جس میں اس کے اپنے ہی خیالات، اعتقادات، محسوسات اور پھر ان میں ہر ایک کے اظہار کے عجیب و غریب استعاروں اور تشبیہوں کے جال بچھے ہیں۔ وہ اپنی اس دنیا میں مگن اور دوسرے کی دنیا سے بے نیاز ہے مگر اس کے باوجود ان سب میں ایک ایسا دردِ مشترک ہے جسے بیان کرنے کی بجائے صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس دردِ مشترک کی تفصیل میں ہماری تمام کائنات شامل ہے۔ اس تفصیل کو جاننا نئی شاعری کو سمجھنا بلکہ خود اپنے آپ سے شناسا ہونا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسی منزل ہے جس کے لئے ابن آدم کو خود آگاہی کی ایسی حدیں عبور کرنا ہوں گی جس کے لئے شاید وہ ابھی تک پوری طرح سے تیار نہیں ہو سکا۔

حرفِ آخر کے طور پر مجھے میراجی کے متعلق یہ کہنا ہے کہ اگر وہ مجھ میں دوسری زبانوں کے ذخیرۂ نظم سے صحیح طور پر آشنا[1] ہونے کا شعور بر وقت پیدا نہ کرتے تو اس مجموعہ کی اکثر نظمیں اپنی موجودہ صورت سے مختلف ہوتیں۔

قیوم نظر

مصری شاہ لاہور

جون ۴۵ء

۱؎ میں بعض انگریزی نظموں سے متاثر بھی ہوا ہوں۔

نیا سال

خوشبوؤں کی مہک سی آئی
رُوئے گل پہ چمک سی آئی
بادِ خزاں کا نرم سا جھونکا
آیا
اور اک سال گیا

تاریکی میں نُور سا چمکا
لرزا موتی سا شبنم کا

آنکھ سی جھپکی، آیا اندھیرا

چھایا

اور اک سال گیا

اُڑتی اُڑتی گرد سی دیکھی

لب پر آہِ سرد سی دیکھی

عمرِ رواں نے اک جھٹکا سا

کھایا

اور اک سال گیا

دسمبر ۴۰ء

رنگ و صوت

پھر اودے کالے رنگوں میں بہکانے والے رنگوں میں
اُٹھے ہیں اُفق کے گوشے سے ڈھل کر انگور کے خوشے سے

وہ بادل جن کے سینے پر
گویا تصویر نظر آئی

بجلی شمشیر نظر آئی بگلوں کی لکیر نظر آئی
پھر خرمنِ ہوش پہ برق گری پھر گلشنِ گوش پہ برق گری

لہرائیں سیمیں آوازیں
یاد آئیں شیریں آوازیں

پھر باغ کے کونے کونے سے خوشبو کے نرم بچھونے سے
شادابیٔ دل سے ہوئے پیدا (اور کس مشکل سے ہوئے پیدا)
وہ پھول کہ جن کی رنگینی
شعلوں کا جگر کہلاتی ہے
کانٹوں کی نظر بن جاتی ہے نغموں کا اثر برساتی ہے
پھر آگ میں رنگ سمو ہی گیا میں اپنے آپ میں کھو ہی گیا
پھر چمکیں رنگیں آوازیں
یاد آئیں شیریں آوازیں

پھر رُوحِ چمن تحلیل ہُوئی پھر ہیئتِ گُل تبدیل ہوئی
کیوں رنگوں میں گرمی نہ ملے آواز کا زیر و بم نہ ملے
کیوں کان سُنیں آنکھیں دیکھیں؟
اِنسان بھی یُوں مجبُور رہے کیا؟
یہ نغمۂ رنگ و نُور ہے کیا؟ یہ قدرت کا دستور ہے کیا؟
کیوں چشم و گوش کی پابندی کیوں عقل و ہوش کی پابندی
یوں اُٹھیں غمگیں آوازیں
یاد آئیں شیریں آوازیں

جنوری ۱۹۴۱ء

غزل

زندگی چال چل گئی شاید
موت پھر آ کے ٹل گئی شاید

کھا رہا ہوں ابھی فریبِ وفا
آرزو پھر بہل گئی شاید

پھر نہ اُٹھی گری جو خرمن پر
برق بھی ساتھ جل گئی شاید

جوششِ عشق کیا کیا تو نے
بات اُن کی نکل گئی شاید

ہنس رہا ہوں فراقِ دائم پر
غم کی صورت بدل گئی شاید

اُن کے رُخ سے نظر نہیں ہٹتی
نوجوانی مچل گئی شاید

تیز اتنی نہ تھی شرابِ حسن
دل کے سانچے میں ڈھل گئی شاید

پھر اُٹھا سیلِ اضطرابِ نظر
پھر طبیعت سنبھل گئی شاید

اگست ۳۵ء

ناچ

سازکی صداؤں پہ

چھن چھپنا، چھپنن چھپنن

ڈھل رہا ہے، بانکپن

ناچ! ناچ سحرِ فن

سازکی صداؤں پہ

ہاتھ، آنکھ، لب ہلیں

حسن کی حدیں ملیں

ذوقِ ناز سے گذر
جسم و جان ایک کر
سرخوشی کے طور ناچ
ناچ! ناچ! اور ناچ

پاؤں میں تھکن نہ ہو
انگلیوں میں دم رہے
فرقِ پیچ و خم رہے
کیفِ زیر و بم رہے
پاؤں میں تھکن نہ ہو
ڈگمگا نہ شمعِ نو

تھرتھرا رہی ہے لَو
جل رہی ہے زندگی
بس یہی ہے زندگی
زندگی کا دَور ناچ
ناچ! ناچ! اور ناچ

مارچ ۱۹۴۱ء

غزل

نگاہوں سے دل میں سمانے لگے ہو
محبت کا جادو جگانے لگے ہو

مٹانے لگے ہو مرا نقشِ ہستی
جوانی کو بے خود بنانے لگے ہو

تصوّر کے خاکوں میں بھرنے لگے رنگ
امیدوں کی بستی بسانے لگے ہو

رگِ جاں میں اُترنے تو نغموں کی لے میں

مری روح میں گنگنانے لگے ہو

مجھے لے چلے ہو کٹھن وادیوں میں
تماشائے منزل دکھانے لگے ہو

گماں بھی نہ ہو جب مجھے زندگی کا
مرے پاس اسوقت آنے لگے ہو

مجھے بھی لگے پیار سے دیکھنے تم
مجھے بھی نظر آزمانے لگے ہو

ستمبر ۳۸ء

عشقِ گریزاں

سرد ہو چکی محفل
اور تو نے پروانے
خواہشوں سے بیگانے
جان سے گذرنے کا
کھیل ہی نہیں کھیلا
بجھ گیا تیرا بھی دل؟
سرد ہو چکی محفل

آدمی کو جینا ہے

ہمکنارِ غم ہو کر

لطفِ زندگی کھو کر

آج اور کل، برسوں

بے بسی کے بل برسوں

زہرِ زیست پینا ہے

آدمی کو جینا ہے

عمر پہ نہ جا اُس کی

یہ طویل مجبوری

اپنی اصل سے دوری

وجہِ دردِ ہستی ہے
ننگِ نام و مستی ہے
عمر ہے سزا اُس کی
عمر پر نہ جا اُس کی

دیکھ رات جاتی ہے
اُٹھ ابھی لپک کر آ
بن سنور چمک کر آ
صبح ہونے سے پہلے
موت ہی سے دل بہلے
شمع جھلملاتی ہے
دیکھ رات جاتی ہے

مارچ ۴۱ء

برسات کی رات

کالی کالی بہت ہی کالی
بے ربط مگر جواں حسینہ
کیا رکھتی ہے زیست کا قرینہ

ملنے لگے اسکے سرمگیں لب
دانتوں کی لکیر ہے درخشاں
یا روح بہار ہے پرافشاں

آئی ہے صدا وہ قہقہے کی
کانپ اٹھی ہے کائنات ساری
ہے ذوقِ جنوں پہ وجد طاری

اب بندھ گیا تارِ آنسوؤں کا
روتی ہے عجیب سادگی سے
پُر ہول مہیب دلکشی سے

نمناک ہوئے ہیں خار و خاشاک
دل چاک ہوا کلی کلی کا
بڑھنے لگا درد زندگی کا

مارچ ۱۹۴۱ء

غزل

کر گیا کام نشانہ تیرا
امتحاں میرا بہانہ تیرا

تیرا ہونا ہی تھا کافی، مانا،
دام تیرا تھا نہ دانہ تیرا

کیوں ہو محدود محبت میری
کیا نہیں حسنِ یگانہ تیرا؟

میں ہی کیوں صرفِ بلا ہوں آخر
نام لیتا ہے زمانہ تیرا

جانے کیا شے تھی نہ سمجھا اب تک
زندگی یعنی فسانہ تیرا

نغمۂ رنگ ہے شورِ بلبل
بوئے گل گویا ترانہ تیرا

کیا یہی تیری حقیقت تھی نظر
رہنِ غم کیفِ شبانہ تیرا

جون ۱۹۴۰ء

مجبوری

یہ چمکتی آنکھیں، یہ ترشے ہوئے لب شعلہ کار
یہ دہکتے گال، یہ شاداب پھولوں کی بہار
کیفیت بر دوش جوبن کا نکھار
ہو رہے ہیں تیری مبہم خامشی کے سائے میں اب شرمسار

اپنی پُرکاری سے تُو جس کو سراہے گی کبھی
تیری مجبوری اُسے چاہے تو چاہے گی کبھی
رہ سکے گا حسن کا یونہی وقار
جانتا ہوں ورنہ کیوں یوں رو رہی ہے آج تو دیوانہ وار

تجھ کو جانا تھا مگر یہ آخری صورت تھی کیا
اور تُو جذبات سے خالی حسیں مورت تھی کیا
کیا نہ تھی اب تجھ میں تابِ انتظار
تیرے اپنوں نے کیا کیوں تجھ کو تیری موت سے یوں ہمکنار

کیوں انہوں نے ناشناسائے جنوں سمجھا تجھے
اپنی ناکامی کے آگے سرنگوں سمجھا تجھے
تیرے احساسات کا اُن پر مدار
شمع آئینِ کہن پر آہ یہ جلنا ترا پروانہ وار

تیرے سینے میں بھی پل سکتی ہے دنیا چاہ کی
سختیاں تو بھی تو سہہ سکتی ہے سوزِ آہ کی

کیوں اُنہیں آیا نہ اس کا اعتبار
حسنِ رنگیں تیری خواہش حسنِ رنگیں کو نہیں کیا زینہار

تیری فطرت اور یوں جبر و رضا کی بندشیں
تُو نے کیوں چاہی ہیں خود بیجا حیا کی بندشیں
دشمنِ ہوش و خرد ہے یہ شعار
وقت باقی ہے ابھی کچھ اب بھی تو کہہ دے نہیں بس ایک بار

جولائی سنہ ۴۱ء

غزل

ماتھے پہ ٹیکا صندل کا اب دل کے کارن رہتا ہے
مندر میں مسجد بنتی ہے مسجد میں برہمن رہتا ہے

ذرّے میں سورج اور سورج میں ذرّہ روشن رہتا ہے
اب من میں ساجن رہتے ہیں اور ساجن میں من رہتا ہے

رُت بیت چکی ہے برکھا کی اور پیت کے مارے بیٹھے ہیں
روتے ہیں رونے والوں کی آنکھوں میں ساون رہتا ہے

اِک آہ نشانی جینے کی رہنی تھی مگر جب وہ بھی نہیں
کیوں دُکھ کی مالا جپنے کو یہ تن کا ساتن رہتا ہے

اے مجھ پر ہنسنے اور کسی کو دیکھنے والو یہ تو کہو
یوں کب تک جان پہ بنتی ہے یوں کب تک جوبن رہتا ہے

دل توڑ کے جانے والے سُن دو اور بھی رشتے باقی ہیں
اِک سانس کی ڈوری اٹکی ہے اِک پریم کا بندھن رہتا ہے

اکتوبر ۳۹ء

اُس بازار میں ایک شام

(م کے نام)

چند چاندی کے سرد سکّوں میں
گرمیٔ حسن بک رہی ہے یہاں
اے غمِ عشق دیکھ بھول نہیں
نغمۂ نور و کائناتِ سرور
کاسۂ زر میں ڈھالتی ہے شام
اور کیا اس میں دلکشی ہے نہ پوچھ

آسمان کی حسیں بلندی سے
اُڑ کے آیا کثیف خاک یہ کون

اے غمِ دوست دیکھ بھول نہیں
پھینک کر پرزے تخیل نے
بیڑیاں بے حسی کی پہنی ہیں
اور کیا شے قبول کی ہے نہ پوچھ

معصیت کی یہ زہد پاش بہار
بن رہی ہے نشاطِ دیدہ و گوش
اے غمِ زیست دیکھ بھول نہیں
تیری تہذیب کے سیاہ نقوش
انتہائے کمال کا ہیں مآل
اور کیا ذوقِ زندگی ہے نہ پوچھ

دسمبر ۴۰ء

خوابِ گراں

قمقمہ بجلی کا روشن تھا — بجھا ہے کیونکر —

چاند بھی نکلا نہیں — ابر — ہوا کا طوفاں
سرد بستر ہے — کھُلے روشنداں

شور — دروازے پہ دستک سی ہوئی تھی — باتیں
جیسے دربان کی آواز تھی کھوئی کھوئی
مجھ سے ملنے کا تھا خواہاں کوئی

ایک سایہ ـــــ کسی مانوس حسیں پیکر کا
جس کے دامن میں کئی ایسے ہی سائے لرزاں
رات کے سینے پہ جس طرح دھواں

وہم تھا میرا کہ دراصل وہی سایہ تھا ـــــ
یاد اب مجھکو نہیں ـــــ جیسے میں گھبرایا تھا
اُس نے کیسے مجھے جتلایا تھا

میرا اقرارِ محبّت ـــــ مری رنگیں قسمیں
جن کی رعنائی میں اُلجھی تھی جوانی اُس کی
اور پھر جاں بھی گئی تھی اُس کی

سہمے سہمے سے مرے قہقہے گونج اُٹھے تھے
محفلِ زیست میں بے معنی تھا اب اُس کا ورود
روحِ ناپاک، خبیث و مردود

میرے آرام کی دشمن مرے سُکھ کی بیرن
جیسے میں اُس کو جھڑکتا ہی چلا جاتا تھا
سایہ معدوم ہوا جاتا تھا

اب نہ تھا کچھ بھی مگر ایک بھٹکتی آواز
شعلے بن بن کے اندھیرے میں بھڑک اُٹھتی تھی
گویا کوندے کی لپک اُٹھتی تھی

اور میں ظالم و بے حس تھا — سُنا تھا میں نے
جیسے اس رات کی تاریکی فروزاں ہوگی
اور مری موت کا ساماں ہوگی

تم بھی جاگ اٹھی ہو — روتی ہو — مری جانِ سبُو!
کیا میں زندہ نہیں — تم تو نہ مجھے جھٹلاؤ
گرم بستر ہے — قریب آ جاؤ

دسمبر ۴۱ء

غزل

آشکارا اس قدر شباب نہ کر
میرا جینا مجھے عذاب نہ کر

مجھ کو چھپ چھپ کے بار بار نہ دیکھ
اِس حقیقت کو بے نقاب نہ کر

میں کہاں اس نگاہ کے قابل
ذرّۂ دل کو آفتاب نہ کر

برق ڈھلتی ہے اِس تبسّم میں
بجلیوں سے مجھے خطاب نہ کر

اہلِ دل اور بھی ہیں محفل میں
مجھ کو پابندِ انتخاب نہ کر

لمحہ بھر لا کے مجھ کو اپنے قریب
عمر بھر خانماں خراب نہ کر

اٹھ رہی ہیں وہ انگلیاں مجھ پر
اس طرح مجھ کو کامیاب نہ کر

مجھ کو حاصل سکونِ مرگ کہاں
یوں مجھے صرفِ اضطراب نہ کر

چھوڑ دے میرے حال پر مجھ کو
مجھ میں پیدا یہ انقلاب نہ کر

دسمبر ۲۹ء

حسنِ آوارہ

اُڑ رہی ہے تیتری — یا ہوائے دلبری
نازک و نحیف سی — نوبر و لطیف سی
گھر نہ بار ہے کوئی — اور نہ اپنی شے کوئی
بس جدھر نکل گئی نکل گئی
اُڑ رہی ہے اُڑ رہی ہے تیتری

سر خوشی کو چھوڑ کر — زندگی کے موڑ پر

باغ و راغ کاٹتی　　آب جُو کو چاٹتی
بُوئے گل سے جھُومتی　　خار و خس کو چُومتی
جی رہی ہے جس طرح بھی جی سکی
اُڑ رہی ہے اُڑ رہی ہے تیتری

ایک بے دماغ نے　　کہنہ سال زاغ نے
زورِ حرص و آز میں　　شورِ برگ و ساز میں
اُس کو جب مسل دیا　　دلکشی کا پھل دیا
آہ بھی نہ بد نصیب کر سکی
اُڑ رہی ہے اُڑ رہی ہے تیتری

اب وہ کس لئے مرے   شہد جمع کیوں کرے
سونگھتی ہے پھول کو   زرنگار پھول کو
پھر اُسے لتاڑ کر   بال و پر کو جھاڑ کر

ڈھونڈتی ہے مسکرا کے اور ہی
اُڑ رہی ہے اُڑ رہی ہے تیتری

اپریل ۴۴ء

غزل

فریبِ حسن کی گھاتیں حسیں ہیں
محبت میں بھی کیا باتیں حسیں ہیں

جما یارنگ ایسا آنسوؤں نے
سمجھتا ہوں کہ برساتیں حسیں ہیں

ستارے ٹوٹتے ہیں صورتِ دل
بظاہر چاندنی راتیں حسیں ہیں

میسّر جو کسی پہلو نہ آئیں
وہی اُن کی ملاقاتیں حسیں ہیں

نہ کیوں دبتی فغاں سرگوشیوں میں
دعاؤں سے مناجاتیں حسیں ہیں

نظرِ حسن سے شکستِ زیست دیکھی
جوانی کی وہی ماتیں حسیں ہیں

مئی ۱۹۴۰ء

داشتہ

رات، دھندلی تیرگی، نمناک گھاس
ٹھہری ٹھہری مضمحل پھولوں کی باس
تنہا اُداس

باغ کی دل سرد خاموشی سے دور
اَن گنت تاروں کا بے ترتیب نور
سامانِ طُور

اُٹھ رہی ہے جیسے موجِ نیم تاب
کہکشاں ـــــ یہ بارہا دیکھا سراب
منزل کا خواب

بھول کر اپنی تمنا کا مآل
گوشۂ دل میں وہی زہرہ جمال
لایا خیال

جس نے وا کی مجھ پہ چشمِ التفات
مجھ کو سمجھا اپنی ساری کائنات
ہر تلخ رات

آج اُس کی دلکشی پٹتی لکیر
اُس کی بڑھتی تیرگی کا غم صفیر
میرا ضمیر

دیکھتا ہوں پھر نجومِ خوش خرام
جانے کب تک لے گا مجھ سے انتقام
یہ حسنِ بام

اکتوبر ۴۴ء

غزل

مل جائیں گے تم کو چاہ والے
ڈھونڈو گے مگر نباہ والے

کب مٹتا ہے شوقِ دید دیکھیں
کب دیکھتے ہیں نگاہ والے

یہ کیسی فراق کی گھڑی ہے
خاموش ہیں آہ آہ والے

مجبور دعا کرو نہ مجھ کو

ہاتھ اُٹھتے نہیں گناہ والے

آیا دمِ واپسیں بھی آخر

آ تو بھی "خدا گواہ" والے

روشن ہیں اُسی سے تنکدے بھی

گُم جس میں ہیں لا الٰہ والے

کیا شے تھی نظیرؔ یہ غزل تیری

چُپ ہو گئے واہ واہ والے

اگست ۴۰ء

ترغیب

مسلسل ہوا نے
سمیٹے ہیں پتوں کے بکھرے خزانے
سفیدے کی شاخوں سے تاروں کا جھرمٹ
محبت کے فتنوں کا جادو جگانے
چلا آ رہا ہے

اندھیرے میں روشن
زمستاں کی راتوں کا یخ بستہ جوبن

بھڑکنے لگا ہے سلگتا تصوّر
تمنّا کی ایذا پرستی کا دامن
بڑھا جا رہا ہے

الجھنے سے حاصل
ہوئی ہے نہ آسان ہوگی یہ مشکل
بلاخیز موجوں کے رستے میں تنہا
کھڑا ہے سمندر کا صد چاک ساحل
کوئی گا رہا ہے

اپریل ۱۹۴۲ء

غزل

زیرِ زمیں جو مجھ کو ہوس آسماں کی ہے
شاید یہ مشتِ خاک تیرے آستاں کی ہے

کرتا ہوں جمع بے سر و سامانیاں کہیں
بجلی کو پھر تلاش میرے آشیاں کی ہے

تو بھی اگر نہیں نہ سہی چشمِ التفات!
مجھ پر نگاہِ لطف غمِ جاوداں کی ہے

اِک رازِ ناکشودہ ہوں اک حرفِ ناتمام

تکمیلِ راز مجھ پہ مرے رازداں کی ہے
گم کر چکا ہوں پائے جہت آشنا کو بھی
لیکن نہ کھل سکا کہ تمنا کہاں کی ہے
کیا موت نے بھی سیکھ لیے دلبری کے ڈھنگ
یہ طرزِ بے رخی تو اس آرامِ جاں کی ہے
قائم دوامِ عشق نظر جس کے دم سے تھا
یہ تربتِ شکستہ اسی نوجواں کی ہے

فروری ۳۶ء

محرومی

اور یہ بھرپور بہار
ان گنت کلیوں پہ دوشیزہ نکھار
ہر جواں شاخ بانداز کمال اٹھتی ہوئی

پھول ہنگامہ بدوش
نازک اندام ہواؤں کا خروش
پھیلتی پھیلتی خوشبوئے وصال اٹھتی ہوئی

تمتماتا ہوا باغ

شوقِ بے پایاں کو منزل کا سراغ
مشتعل آرزو ہمرنگِ جمال اُٹھتی ہوئی

ہر برس تیرا خیال

بُن ہی لیتا ہے کسی طور یہ جال
ورنہ تو کس کے لئے بادِ شمال اُٹھتی ہوئی

جون ۷۴ء

واپسی

گہری نیند سے جاگا سبزہ
چھوٹی سرسوں یوں لہرائی
موسم گل نے لی انگڑائی

شاخ شاخ پر کھلے شگوفے
کچی کوری کلیاں آئیں
اٹکھیں، چٹکیں، دودھ نہائیں

چہک رہا ہے پتّہ پتّہ
سُنتا ہوں اَن سُنے فسانے
دھیان کی دنیا مانے نہ مانے

جانے اب کیوں ٹھان چکی تو
بھُولی بات کو دہرانے کی
میرے سائے میں لوٹ آنے کی

کون اِس جھونکے کو سمجھائے
صحنِ چمن سے جو اُٹھا ہے
سُوکھے پیڑ کو چھیڑ رہا ہے

جولائی ۴۴ء

غزل

دلِ خوگرِ غم اور لبِ فریاد ہے خاموش
اے دل کے ستم اب ستم ایجاد ہے خاموش

کس منہ سے ہو محرومیِ قسمت کی شکایت
اک آہ تھی وہ بھی دمِ فریاد ہے خاموش

پامالِ محبت ہوں نہ سمجھے گا زمانہ
یوں صورتِ شبنم مری اُفتاد ہے خاموش

کیا نالۂ غم ہیں ہے ترے مرغِ گرفتار
کیوں شکوۂ بیداد پہ صیاد ہے خاموش

رہتی تھی نظر جس کی رُخِ لالہ و گل پر
گوشے میں قفس کے وہ چمن زاد ہے خاموش

کرتا تھا نظر سوزِ جگر سے جو چراغاں
عرصہ ہوا وہ بندۂ بیداد ہے خاموش

دسمبر ۲۵ء

خلشِ تاثّر

خاموش ہوا بھیڑوں کا گلہ چلتے چلتے ممیا کر
جا پہنچا شاید باڑے میں بوسی رستے میں پھیلا کر
چپ چاپ کھڑا ہے دُور ادھر وہ جنگل کالی چیلوں کا
سرسبز پہاڑوں کو پُرہول بنانے والی چیلوں کا
آواز نہیں آتی اب جھیل کی جانب سے مرغابی کی
سنسان فضا ہیجان ہوا میں ہے لرزاں روحِ خموشی کی
یوں لائی دوش پہ لاش سی کیا رنگیں دن کی بربادی کی
یہ شام، یہ گہری شام، یہ ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی

قدرت کے سکوتِ مجسم کی اس ہیبت آرائش سے
وادی کے ذرّے ذرّے کی ہم آہنگی کی نمائش سے
ہر نقشِ شجر ہر فیل نما پتھر دنیا ہے طلسموں کی
حد ہی نہیں آتی کوئی نظر اس طرفہ فسوں کی قسموں کی

ہر شے پر خواب سا طاری ہے اور میں ہوں صرف بیخوابی
لینے ہی نہیں دیتی دم مجھ کو میری فطرتِ سیمابی
اے کاش کبھی کم کر سکتی میرے بھی دل کی بے تابی
یہ شام، یہ گہری شام، یہ ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی

میں مصنوعات کا پروردہ بلکہ انسان بھی مصنوعی
میرا سامان بھی مصنوعی میرا ایمان بھی مصنوعی

بسنے والا امیدانوں کے ہنگامہ پرور شہروں کا
بے ربط سکوں سے ناواقف اور شوریدہ سر شہروں کا
میں قدرت کے اسرار و رموزِ پنہاں سے آگاہ کہاں
اس اندھیارے کے اتھاہ سمندر کی میرے دل پہ چھاپ کہاں
اور مجھ کو دکھاتی ہے نورِ حقیقت کے جلووں کی راہ کہاں
یہ شام یہ گہری شام یہ لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی

یہ منظر خوش آئند تو ہیں میں ان سے مگر کیوں ڈرتا ہوں
کیوں انکی دل آویزی کو وحشت ناک تصور کرتا ہوں
کیوں مجھ کو بسترِ سنگ و شجر کا ماحول سکونِ قلب نہیں
کیوں میری دنیا اس دنیا سے جا کے بسی ہے دور کہیں

کیوں میں نے ڈالا ہے اپنے ہی جی کو آپ ہلاکت میں
کیوں ہو ہی نہیں جاتا میں خود پیوستہ جہانِ قدرت میں
کیوں لے ہی نہیں لیتی مجھ کو اپنی آغوش کی وسعت میں
یہ شام، یہ گہری شام، یہ ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی

ستمبر ۴۰ء

انجام

دیوداروں کے تُرش رُو پتّے — جھڑ کے پیوندِ خاک ہو بھی چکے
جھیل کی لُٹ چکی ہے شادابی — کب سے میداں میں پہنچی مرغابی
ہر طرف نرم برف جمنے لگی — سر برآوردہ ندی تھمنے لگی

چیختی ہے ہوا گزرتی ہوئی
کوہساروں کے پار اُترتی ہوئی

میں ہوں اور اک بسیط تنہائی — خشک و تر پر محیط تنہائی
راہ بھولا ہوا ہوں منزل کی — کیا کہوں کیا ہے کیفیت دل کی

اشک آنکھوں سے بہتے جاتے ہیں کتنے افسانے کہتے جاتے ہیں

سانس رکتا ہے لڑکھڑاتا ہوں
ذرّے ذرّے سے خوف کھاتا ہوں

ایک شفاف ٹکڑا بادل کا یا کوئی پرزہ نوری آنچل کا
دُور اُفق کے قریب لہرایا آرزوؤں نے دام پھیلایا
میں نے چاہا کہ اپنی بات کہوں ہو سکے گر تو اُسکے ساتھ چلوں
میری رفتار برق وار نہ تھی
اور اُسے تابِ انتظار نہ تھی

برف کے اک وسیع میداں پر اب پڑا دیکھتا ہوں خوابِ سفر

راستہ ہے نہ رہنما کوئی　　میرے پہلو سے گم ہے سایہ بھی
شام کی زردی آئی جاتی ہے　　مُردنی بن کے چھائی جاتی ہے
دم بخود ہے ہوا گزرتی ہوئی
کوہساروں کے پار اُترتی ہوئی

جولائی ۱۹۴۱ء

تھکن

رات کی نیلی سیاہی لے چکی ہے اپنے دامن میں سنہری شام کو
حسن کی تاریک رعنائی کی دنیا پر ہے رنگِ بے دلی چھایا ہوا
نیم جاں فِطرت کی مبہم کردشوں پر نغمۂ خاموشی لہرایا ہوا

تھم گئی ہے شعلہ پرور دن کے محشر خیز ہنگاموں کی جوشِ تندرو
رفتہ رفتہ بجھتے بجھتے اپنی منزل کے سکوتِ مضمحل کی چھاؤں میں
آج جنبش ہی نہیں ہے کیفِ تنہائی کی زنجیروں سے بوجھل پاؤں میں

فلک کی آتشوں میں غرق ہے تارِ نفس موہوم احساسات کا
شمع زر تارے نظر آتے ہیں جیسے دل گرفتہ پھول کملائے ہوئے
جن کی تابانی کے نغمے خارزاروں کے شگوفوں سے ہوں بل کھائے ہوئے

ہر طرف اک آبنوسی خوابِ نامعلوم کا پھیلا ہے بحرِ بے کراں
جس کی سطحِ پُر سکوں پر لوٹتی ہے زندگی کی خستہ ساماں چاندنی
یعنی موت کے سانچے میں آخر ڈھلنے والی غم بداماں چاندنی

مارچ ۱۹۴۱ء

غزل

دیوانگی دل کی توقیر نہیں جاتی
اب خاکِ محبّت بھی اکسیر نہیں ہوتی

اے برقِ فنا تو ہی تقدیر مری بن جا
غارت گرِ ساماں سے تدبیر نہیں ہوتی

کیوں دیکھتے ہیں مجھ کو حیرت سے جہاں والے
کیا غم کی یہاں کوئی تصویر نہیں ہوتی

میں لائقِ کشتن ہوں، یہ سچ ہے مگر دیکھو
تقدیر بگڑ جانا تقصیر نہیں ہوتی

آدابِ وفا سیکھو، اندازِ جفا چھوڑو
یوں قصرِ محبت کی تعمیر نہیں ہوتی

کیوں درد نہیں بڑھتا کیوں موت نہیں آتی
کیوں خوابِ پریشاں کی تعبیر نہیں ہوتی

تاثیرِ محبت سے آہیں تو ہوئیں پیدا
آہوں میں نظر پیدا تاثیر نہیں ہوتی

—

دسمبر ۳۵ء

بے بسی

ایک بے کیف شام کے بس میں
رینگتے سائے، اونگھتی راہیں

چند سہمے ہوئے چہے اور میں
زندگی رنگ و بُو سے بیگانہ

سرنگوں، دل گرفتہ اور اُداس
آہ وہ اُسکے قہقہے اور میں

چاہتا ہوں گزر سکوں اک بار
آرزؤں کے چیستانوں سے

ہوں جہاں لاکھوں چھپے اور ہیں

ہر نفس میں ہو نغمۂ ناہید

خاکِ پا ہو میری بہار بدوش

یہ سماں جاوداں رہے اور ہیں

دلِ ناکام کی تن آسانی

خندہ زن ہے مرے ارادوں پر

ورنہ دریائے غم بہے اور ہیں؟

جانے یونہی رہیں گے اب کب تک

رینگتے سائے، اونگھتی راہیں

چند سہمے ہوئے چہے اور ہیں

ستمبر ۴۳ء

خزاں

تصورات کی دنیا بھی میرے بس کی نہیں

چمکتے خوابوں کی رعنائیاں تمام ہوئیں

تمام انجمن آرائیاں تمام ہوئیں

جہاں میں میں ہی نہیں ہوں جہاں میں کچھ بھی نہیں

رہینِ شام ہی دیکھے نگاہ والوں نے

وہ دن کہ جن میں محبت کے جانفزا نغمے

مہکتے پھولوں کی آغوش میں مچلتے تھے

جنہیں گداز کیا تھا شگفتہ حالوں نے

میرے خیالوں سے روشن تھی کائناتِ بہار
انہی کے دم سے میرا عہدِ شوق رنگیں تھا
جمالِ گلشنِ فردا میں رنگِ تزئیں تھا
نہ ٹلنے والے غمِ زیست پر تھے جو نثار

زمیں کے سینۂ پامال سے ہیں پیوستہ
بکھرتے خاک اُڑاتے بھٹکتے جاتے ہوئے
درِ سکوں کو تغیّر سے کھٹکھٹاتے ہوئے
وہ پتّے سائے میں جنکے چمن تھا گلدستہ

جولائی ۱۹۴۱ء

مآل

اپنی امیدوں کے ویرانوں سے
سر جھکائے ہوئے تنہا چپ چاپ
میں کسی طور گذر آیا تھا
پھر مرے اُجڑے سکوں سے بھرپور
ہر طرف پھیلی ہوئی دنیا میں
نغمۂ گل نہ گلِ نغمہ تھا

میری نخ بستہ حرارت سے مگر

چند کھوئی ہوئی نظروں کا جہاں
آج یوں اُلجھا کہ جی جانتا ہے
جیسے کچھ پا ہی لیا ہو اُس نے
میری منزل کے خرابے کا نشاں
دردِ دل خاکِ جہاں چھانتا ہے

جانے کیوں اب یہ گماں ہوتا ہے
اپنی سنگین خموشی کو لئے
اِک نئے سانچے میں ڈھلنا ہے مجھے
اور اُسی درد کی لیکر قندیل
جس کو تاریکی میں رکھا اب تک
اپنے ہی سائے پہ چلنا ہے مجھے

نومبر ۱۹۴۴ء

غزل

بسکہ نہ کام آ سکا عشق میں دل دیا ہوا
حاصلِ زیست ہو گیا نام ترا لیا ہوا

حدِ جنوں سے ہوں پرے ورنہ کہاں کہ رہ سکے
خندۂ نوبہار سے چاکِ جگر سیا ہوا

عشق کی آبرو وفا حسن کی آرزو فنا
میرا کیا تو کیا ہوا آپ نے جو کیا ہوا

کیوں نہ ہوائے بے خودی ہو مجھے وجہِ سرخوشی

دے کے سکونِ زندگی ہے یہ جنوں لیا ہوا

تیرے کرم سے گو اٹھا لطفِ جہانِ مدّعا

کم نہ مگر ہوا ترا ذوقِ ستم دیا ہوا

چارہ گرِ حیات نے موت سی شے بھی دی تو کیا

شوقِ طلب میں بارہا زہر یہ تھا پیا ہوا

نومبر ۳۹ء

زندگی

آل حسن کی ناکامیوں میں کھوئی ہوئی
خزاں سے گزار خزاں باغ سے گزرتی ہے

نحیف پتّے سرکتے ہیں جمع ہوتے ہیں
بکھرتے ہیں پھر قافلوں کی صورت میں
عجیب خشک سی چلتی ہے بادِ نادیدہ کار

یہ تیرگی کو اُجالا سمجھ کے چمکا دو

فضا کے سینے کو بوجھل پروں سے سہلاتا
نہ جانے کونسی بستی کو اُڑتا جاتا ہے

اُداس چاند کے دامن میں روشنی بھی نہیں
فسردگی ہی جھلکتی ہے چشمِ انجم سے
بہار آئی تھی کس شام کے تبسم سے

جنوری ۴۵ء

غزل

مٹ مٹ کے محبت میں تیری یوں تجھ کو پکارے جاتے ہیں
کٹ کٹ کر دریا کی تہ میں جس طرح کنارے جاتے ہیں

کیا خوب ہے تیری محفل بھی محفل ہے کہ چکر دنیا کا
کچھ نیند کے مارے آتے ہیں کچھ در دکے مارے جاتے ہیں

کیوں عشق کو مٹنا حسن کو بننا لازم تھا معلوم ہوا
کچھ کام بگاڑے جاتے ہیں کچھ کام سنوارے جاتے ہیں

رہ مل تو گئی ہے منزل کی لیکن یہ ہوئی حالت اپنی
ارمان بڑھائے جاتے ہیں اور حوصلہ ہارے جاتے ہیں

یا دورِ محبت تھا وہ بھی آنکھوں میں ہیں نقشے پل پل کے

یا وقت یہ آیا ہے کہ یونہی اب عمر گذارے جاتے ہیں

امیدوں کی بستی اجڑی دل مٹ گیا لیکن پھر بھی ہاں

اشکوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آہوں کے شرارے جاتے ہیں

شام آئی بھی ہے آنا تھا انہیں کیا رات پہاڑ سی کٹ بھی گئی

تنگ آ کے فریبِ عشق سے یا چاند ستارے جاتے ہیں

نومبر ۴۰ء

نورجہاں کا مزار

ہر طرف چھتریاں کھجوروں کی
جن کے سائے میں کچھ درد و غبار
سرد خاموش خستہ حال نحیف
بوڑھی بیلوں کے بوجھ سے خمدار
ان کو گھیرے ہیں سرو گردہ آلود
ننگِ ہستی ہوا ہے جن کا وجود

جن کے سینوں میں راز کی صورت

کانوں تک پہنچی نیم باز آنکھیں
احمریں گال، کھلتی پیشانی
کھنچتے ہونٹوں کی آتشیں قوسیں
جن کی خاطر بنے تھے راج محل
خوشنما شہر، قلعے، تاج محل

سروِ بے باکِ نسلِ تیموری
سر برآوردہ، وضعدار، بلند
خوگرِ گرم و سرد تہذیب، حلیم،
بے نیازِ مآل، حسن پسند
صرفِ سودائے انتقام نہیں
اپنے انجام کا غلام نہیں

فروری ۴۳ء

اپنی کہانی

اُس کی آنکھیں ہیں — دہکتے ہوئے انگاروں پر
مرمریں راکھ کا باریک سا شفاف غلاف
دم بخود شعلوں کی حدّت سے چڑھا ہو جیسے

شیر کے پنجرے کو گھیرے ہیں تماشائی کئی
دوپہر، موسمِ سرما کی بھلی دھوپ مگر
وہ کسی اور ہی عالم میں پڑا ہو جیسے

اُس کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے وہی راست ابھی
جس میں کمزور شکاری نے ریاکاری سے
ایسی دنیا میں وہ خود جس کا خدا ہو جیسے

جس میں ہنگامۂ محشر ہو کبھی اُس کا خرام
سانس لے سکتا نہ ہو جس میں کوئی اُس کے سوا
اُس کی آواز جہاں سیلِ بلا ہو جیسے

ایسی دنیا میں کیا سیگوں ہاتھوں سے اُسے
دست و پا باندھ کے یوں فاقہ کشی پر مجبور
جامِ آزادی میں پیغامِ فنا ہو جیسے

تنگ و تاریک ہے اب روزنِ زنداں کی طرح
تلخیٔ جبر میں لپٹا ہوا پامال گپھا
جس میں وہ — کھُدرا سا اک ڈھیر پڑا ہو جیسے

اور پھر سامنے اُس کے ہیں پھُدکتے آہو
چڑچڑاتے ہوئے لنگور، اکڑتے بندر
بوڑھا لومڑ — جو کھڑا اُونگھ رہا ہو جیسے

اُس کی آنکھوں میں اُتر آیا ہے احساس کا خوں
سرد لوہے کی سلاخیں، یہ گراں دیواریں
توڑ ہی ڈالے گا اب ٹھان چکا ہو جیسے

دسمبر ۱۹۴۱ء

نئی تحریکیں

ہوا چلی — کنول کنول سے کھیلتی ہوا چلی

پھسلتے سینۂ جہاں نما میں تھرتھری سی ہے
صدائے آب و رنگ جیسے اٹھ کے گہری نیند سے
دھلی ہوئی فضا کے مشکبو بدن میں رچ گئی
ہجومِ موجِ نیلگوں یہاں وہاں کہاں نہیں!
ڈلکتے موتیوں کا تھال ایک ایک پتّہ ہے
نکھر رہا ہے دمبدم جو سطحِ آب سے لگا

جسے سنورتی تیرتی بطوں کا اجلا بانکپن
چھپی ہوئی کشاکشِ نمو میں گم نہ کر سکا

ہوا بڑھی — ہوا کے بے دراخرام سے اٹھا
لچکتی سرسراہٹوں کا نغمۂ طلسم زا
وہ ایک سربلند لہر دفعتاً اچھل پڑی
کنارِ ریگ سے پرے کی داستاں ہی اور ہے
ہرے بھرے چنے کے کھیت میں مچی ہے کھلبلی
لپٹ لپٹ کے جھونتی ہے ایک ایک شاخِ نو
مچلتی لہر اک عجیب کیفیت میں ڈوب کر
وہ جیسے ایڑیاں اٹھا کے پھول چومنے کو ہے
مگر کہاں — ہوا کے بل پہ نرم نیلگوں کنول

سرک کے سر اُٹھا کے دور ـــ اور دور ہو گیا

پھر ایک سمت بڑھتا راگ تھم گیا ـــ یہ کیا ہوا
سجیلی طرحدار گردنوں کا دلنواز خم
ہوا کے بے پناہ سلسلے کو جیسے کھا گیا
چھلکتی جھیل زندگی کی کشمکش کو بھول کر
فنا کے گھاٹ آتے آتے سکوں سے پھر لپٹ گئی
مچلتی لہر کے جنوں کا اب کہاں کوئی نشاں
بطیں بھی سو گئیں نہ جانے کس جہاں میں کھو گئیں
فضا کے دم بخود دلوں پہ کوئی داستاں نہیں
کنول کنول سے کھیلتی ہوا کی زندگی سے گئی

فروری ۴۵ء

جنگ

اداس کھیتی میں محروم نقشِ پا راہیں
فسردہ گھاس کے سینے سے دُور ہیں سنّاٹے
شکستہ گاؤں میں دہقاں نہ خستہ جاں گاتے

شگفتگی شام کی سرخی سیاہ فام ہوں
گراں ہے خاطرِ گل پر لپیٹ موجۂ باد
ملول گوشۂ صحرا میں ہے لبِ فریاد

رہینِ شائبہ موہوم رس بھرا پیغام
جگر فگار ہے مہجورِ آہِ نرم و گداز
شبِ دراز، ستارے، نہ ماہِ محرمِ راز

جمیل خاک کے ذرّوں پہ ہوگی کے نشاں
برہنہ گرسنگی بارِ زندگی سے چور
مہیب صبر کے دامن میں بے بسی مستور

عدوئے دوست نما اور فریبِ شانِ وطن
درِ رقیب پہ جلتے ہیں جسم و جانِ وطن

نومبر سنہ ۴۱ء

جوانی

تُو نے دیکھا ہے اُسے

جاتے ہوئے ارضِ حجاز

کتنا موزوں تھا جواں قدِ دراز

— دِل میں کھبا جاتا ہے

تو نے چاہا ہے اُسے

مصر ! ابوالہول جمال

کتنے مردانہ تھے اُس کے خد و خال

— درد بڑھا جاتا ہے

تُو نے پایا ہے اُسے
شمعِ شبستانِ فرانس
کس قدر گرم تھا اُس کا ہر سانس
— جسم جلا جاتا ہے

تُو نے روندا ہے اُسے
جنگ! اُٹھا میرا سہاگ
مادرِ گیتی مرے واسطے جاگ
وقت اُڑا جاتا ہے

جنوری [illegible]ء

غزل

اے یار چھوڑ تصور میں مرنا امیداں یہیں نکل آ جینے کو

طوفان کے سینے پر کھینا ہے تجھ کو اپنے سفینے کو

گرتوں کو سنبھالنا خوب سہی لیکن یہ سنبھلنے کو گرنا

حیرت ہے کہ چوکا کیوں تو نے جینے کے ایسے قرینے کو

کیوں اے دنیا انجام سے یوں سہمی ہوئی دیکھ کے تاریکی

بن تیغ کی دھار اتر دل میں کر اور چیر دے اپنے سینے کو

پامال چمن میں تیرے اگر آئے تو بہارِ نو آئے

شبنم کی بجائے غنچوں کو تاروں کا لہو دے پینے کو

ہر چند پسند ہیں تجھ کو نظر یہ خاک یہ چاک گریباں کے

یوں منظرِ عام پہ لانے سے کیا بربادیٔ دل کے خزینے کو

جنوری ۴۲ء

شبخون

کالی، اندھی رات، بھیانک
پھیلی پھیلی خاموشی کا
کالا جادو، اس میں اچانک
اِک ہنگامہ — سیلِ بلا ہے
ذرّہ ذرّہ کانپ اٹھا ہے

دوڑ رہے ہیں وحشی گھوڑے
ہیبت ناک گھنی تاریکی

مار رہی ہے آتشیں کوڑے
راج محل پیوندِ زمیں ہیں
شعلے ہیں اور اُنکے مکیں ہیں

چمکی خون آشام سیاہی
چیخیں، آہیں، ہچکیاں، نالے
دہشت سے لپٹی ہے تباہی
راکھ کے ہر سو ڈھیر کھڑے ہیں
زندہ مردے جن میں گڑے ہیں

بڑھتے چڑھتے جنوں کے سہارے

مثلِ شہابِ ثاقب پل میں
آئے گئے برسا کے شرارے

نقشِ پا ہے نہ راہگذر ہے
ویرانی تا حدِّ نظر ہے

وحشی گھوڑے مگر ہیں فسانے
وقت نے جن سے تراشے ہیں
اُلٹے سیدھے لاکھ بہانے

خواہشِ سیم و زر بھی نہیں ہے
فاقہ کشی کا ڈر بھی نہیں ہے

اسکندر، چنگیز، ہلاکو
یکساں تھا ان سب کی نظر میں
چشمۂ حیواں، چشمۂ باکو
اب بھی وہی ہے فطرتِ آدم
بربادی میں ہے عظمتِ آدم

غزل

آئے ہو یوں تباہ کرنے کو
آفریں اِس نگاہ کرنے کو

جان دیتا ہوں اپنے مرنے پر
سانس لیتا ہوں آہ کرنے کو

میری ہستی ہے دہر میں گویا
زندگی کا گناہ کرنے کو

جل گیا مثلِ آتشِ خاموش

دل تڑپتا تھا چاہ کرنے کو

سادگی میں ہے بانکپن پنہاں

حسن کو بے پناہ کرنے کو

اُن کو چاہوں نظر وہ بات کہاں

چاہتا ہوں تباہ کرنے کو

اکتوبر ۳۵ء

بنی آدم

یہ بھیانک سیہ، گھنا جنگل
جس کی صورت سے خوف طاری ہے
کون جانے کھڑا ہے یوں کب سے
وقت پر اس کی عمر بھاری ہے

موٹے موٹے تنے درختوں کے
جھرّیاں چھال پر درشت و مہیب
گرتی گرتی جھکی جھکی شاخیں
اُبھری اُبھری جڑیں عجیب عجیب

سمٹے سمٹے سے زرد زرد پتّے
ساتھ موسم کے آتے جاتے ہوئے
پھیلے پھیلے سے ہر طرف سائے
گھاس پہ تیرگی بچھاتے ہوئے

رات دن، ماہ، سال، سال بہ سال
ان کی ہیبت میں ڈھلتے جاتے ہیں
اور یہ پُر ہول نقش صدیوں کے
اپنی عظمت سے جلتے جاتے ہیں

فروری ۱۹۴۱ء

آندھی

دن کو لپیٹ میں لیکر اُٹھی اپنا رُوپ دکھانے
شام کی گہری دھندلاہٹ کی بوجھل خاک اُڑانے

دنیا پر چھا جانے

اپنی رَو میں بہا تی سب کو چلّائے، پھنکارے
ساتھ نہ دے جو اُس کو مٹائے رہ رہ کوڑے مارے

بپھرے اُسکے سرہانے

گھنے درختوں کی شاخوں کو موڑے توڑے جھکائے
ریت پہ بنے ہوئے محلوں کو جھٹکے دے دے گرائے
ڈھونڈے نئے ٹھکانے

بھاری بھرکم دروازوں کے پھاڑے رنگیں پردے
تہ خانوں میں روشن شمعوں کو ہنس کر گل کر دے
کہے انوکھے فسانے

رات — اندھیری رات، یونہی ہر لمحہ رنگ نکالے
سہما سمٹا اُجالا کیسے اِس طوفان کو ٹالے
صبح! کوئی کیا جانے

اکتوبر ۴۳ء

شام

مشتعل حسن کا انبوہِ کثیر
ہر طرف پھیلتا، بڑھتا، چڑھتا
روندتا آگ لگاتا، اُٹھا
اب کہاں وقت دل و دوست کی غمخواری کا

خون آلودہ اُفق کی زنجیر
پیچ و خم کھاتا پُراسرار دھواں

دُور اک ڈوبتی آوازِ گراں
ہر نشاں جانکنیٔ عشق کی دشواری کا

رات کی سرمگیں زلفوں کے اسیر
ڈبڈباتی ہوئی آنکھیں، تارے
نوحہ خوانی کو ہیں نکلے، بارے
دن کی میّت پہ بھرم کھُل گیا عیّاری کا

دن، یہی میرے جنوں کی تدبیر
اِک سکوں زار سے ٹکراتی ہے
تیرگی بڑھتی چلی جاتی ہے
مرمریں صبح بھی اک خواب ہے بیداری کا

جون ۴۳ء

صبحِ کاذب

تیرگی جیسے اُٹھی —

دست و پا یوں زلیست کے آثار پھیلانے لگے
رات کی آنکھوں کے گوشے بھی نظر آنے لگے

راہ ناہموار، تنگ —

جا رہا ہوں پھر اُسی کہنہ سرائے ناز کو
چھیڑتا تھا میں کبھی جس کے سرودِ ساز کو

بند ہیں بھاری کواڑ —

کھولتا ہوں جانے کتنے بندھنوں کو توڑ کر
اسکے گھٹنے، اُس کے بازو، اُس کے سر کو پھوڑ کر

کھولتا ہے خونِ گرم —

دیکھتا ہوں اُس کو ایسے دوست کی آغوش میں
جس کی کوشش سے میں دبتا ہوں اپنے جوش میں

لوٹتا ہوں سرنگوں —

بڑبڑاتا، گرتا پڑتا، ٹھوکریں کھاتا ہوا
صبحِ کاذب تھی کوئی یوں دل کو سمجھاتا ہوا

[illegible]

اُلجھن

یہ تیرگی
اور ہر گھڑی بڑھتی ہوئی
اس کی انوکھی دلکشی
جیسے سکوں کے بحرِ بے پایاں کی حامل ہے یہی
دنیا کی منزل ہے یہی

جیسے یہی
پھیلی ہوئی نزدیک و دور
اِک جنّتِ کیف و سرور
جیسے اسی کی گود میں آسودگی پھولے پھلے

تسکین پائیں دل جیسے

اور روشنی

یہ مرجعِ پیکِ خیال

صورت گرِ حسن و جمال

اپنی چمکتی وسعتوں کا لاکھ پھیلائے فسوں

ممکن کہاں اس میں سکوں

لیکن نہیں

دن — کارزارِ رنگ و بُو

آئینہ دارِ آرزو

ہے گھاس پر بکھری ہوئی شبنم اسی سے ضوفشاں

جیسے زمیں پر کہکشاں

یہ دن یہی
ہنگامہ آرائے بہار
بے آب چہروں کا نکھار
اُڑتا ہے لیکر اس طرح انساں کی سعیٔ خام کو
گویا خدا ہے نام کو

یہ کشمکش
یہ روشنی کی زندگی
یہ تیرگی کی دلکشی
کیا اک پریشاں خواب ہی بن جائیں گے یہ دن یہ رات
جانے کہاں ہے کائنات

جولائی ۴۴ء

غزل

اُن پہ آئی کہاں ٹلی ہے ابھی
ذکر میرا گلی گلی ہے ابھی

ہر طرف شورِ نو بہار سہی
دم بخود پھر بھی ہر کلی ہے ابھی

جان دینا جنوں سہی لیکن
رسم دنیا میں یہ بھلی ہے ابھی

میری صورت پہ بھولنے والے
اُنکے وعدوں میں یہ ڈھلی ہے ابھی

غنچۂ دل کبھی کھلے شاید
زندگی کی ہوا چلی ہے ابھی
اک امیدِ سحر ہے رات کے پاس
اُس کے خوں میں یہی پلی ہے ابھی
اور کیا ہونگے زیست کے آثار
مجھ سے پیوستہ بے کلی ہے ابھی
جانے کیونکر ہوا نظر خاموش
بزمِ عالم میں کھلبلی ہے ابھی

اگست ۴۲ء

ساقی نامہ

پلا ساقیا بادۂ ارغواں — زمیں بن گئی رشکِ باغِ جناں
فلک پر ہے سرگرمِ مشقِ خرام — پسِ پردۂ ابر ماہِ تمام
مگر خواہشِ دیدِ حسنِ زمیں — اُسے رکھ نہیں سکتی حجلہ نشیں،
ردائے سیہ پھاڑ کر بار بار — وہ کرتا ہے نظارۂ روزگار
نگاہوں میں اسکی ہے مینائے نور — زمیں پر بہاتا ہے دریائے نور
فسوں کار ہے کس قدر چاندنی — ستاروں کی ہے ہمسفر چاندنی
خموشی میں گم ہے اُدھر شہدرہ — ہوا ہے ادھر سیمبر مقبرہ
وہ مغلوں کی عظمت کا ادنیٰ نشاں — وہ سائے میں جس کے ہے نورِ جہاں

جہانگیر کی آخری خواب گاہ — جہاں عشق نے آ کے چاہی پناہ

چمکتا ہے یوں گنبدِ مرمریں — کہ تھا طور کا جیسے منظر یہیں

در و بام و دیوار ضو ریز ہیں — غمِ دہر میں عشرت آمیز ہیں

وہ ہے دلکشی صورتِ آب میں — مہ و ابر اُترے ہیں تالاب میں

ضیا پاشیوں کا جہاں ساتھ ہے — عروسِ فلک کہکشاں ساتھ ہے

نہیں رعبِ جلوہ سے تابِ بیاں — کھڑا سر کے بل مقبرہ ہے یہاں

کھجوروں کے سائے میں سبزے کا رنگ — درخشاں کناروں سے کرتا ہے جنگ

شبِ تار میں ہے وہ تابندگی — چمک اُٹھے جس سے رہِ زندگی

ہوا ہلکی ہلکی سی چلتی ہوئی — گلوں کے تبسم میں ڈھلتی ہوئی

مگر جس سے جھکتا نہیں خود پسند — سرِ آسماں بوس سرو بلند

چٹکتی ہیں کلیاں اس انداز سے — کہ پیدا ہوں نغمے ہر آواز سے

یہ موسم ہو اور زندگانی کا ہوش — یہ محفل ہو اور ہو مغنی خموش

''قرارِ دلِ بے قرار آگئی

بہار آگئی پھر بہار آگئی

دعائیں ہوئیں میکشوں کی قبول

عروسِ مئے مشکبار آگئی

گلِ نرم پر برگِ نوخیز پر

جوانی سرِ شاخسار آگئی

بھری ہیں فضاؤں میں موسیقیاں

مغنیِ فطرت بہار آگئی

گہر ہائے شبنم بکھرتے نہ یوں

چمن کی مگر گلعذار آگئی

کیا ہے زمانے کو پابندِ عیش

بہانے سے وہ سحر کار آگئی

نظر آ رہی ہیں جو رنگینیاں
گلستاں کی پروردگار آ گئی"

مغنی ستم تو نے ڈھایا یہ کیا — قصیدہ سا مجھ کو سنایا یہ کیا
پریشان کر دی طبیعت مری — نہ سمجھا مجھے تو بھی قسمت مری
قسم ہے تجھے نغمہ بارِ ازل — نہ آئی تھی کیا تجھ کو کوئی غزل
غزل وہ محبت کی پرواز گاہ — وہ پامالِ غم دل کی رنگین آہ
بھرا جس میں ہو کیفِ ہجر و وصال — تمنا کا خوں بے کسی کا خیال
ہوئی ہو بیاں عشق کی واردات — بگڑتی ہو پھر جس میں بن بن کے بات
جوانی کا وہ قصۂ دردناک — گریبان کے جس پہ ہنستے ہوں چاک
جہاں بانکپن سے بڑھے سادگی — جہاں لطف دیتی ہو اُفتادگی
جہاں خامشی حسنِ تقریر ہو — جہاں غم مسرت کی تصویر ہو
نظر جس میں آئیں وفاداریاں — ستم دوستوں کی ادا کاریاں

غضب ہے بگڑ میں یہ کہتا ہوں کیا — کسی اور دنیا میں رہتا ہوں کیا
بیاں میرا کتنا ہے بے ربط سا — محبت کا ہے کیوں مجھے خبط سا
پلا ساقیا ہاں پلا ساقیا — میرے درد کی لا دوا ساقیا
حقیقت سے نا آشنا ہوں ابھی — تمناؤں سے کھیلتا ہوں ابھی
ابھی دیکھتا ہوں رُخِ آسماں — ابھی زندگی کا مجھے ہے گماں
ابھی دوڑتا ہے رگوں میں لہو — ابھی جی میں ہے موت کی آرزو
ابھی آتشِ عشق دم ساز ہے — ابھی نغمۂ سوزِ غم ساز ہے
ابھی کر رہا ہوں وفاؤں پہ ناز — ابھی دردِ جانکاہ ہے دل گداز
ابھی دشت پیما ہے جوشِ جنوں — ابھی کیف زا اضطرابِ سکوں
ابھی حشر ساماں ہے یادِ شباب — ابھی ذرّہ دل میں ہے آفتاب
ابھی چاہتا ہوں محبت کو میں — حسینوں کو نغموں کو دشت کو میں
تکلف کا پردہ اُٹھا مطربا — نہ اب ذوقِ بیخود کو اور آزما

معطّر فضاؤں پہ چھائے غزل پھڑکتی ہوئی کوئی آئے غزل

اُٹھا نا غمِ جاں ستاں اور ہے
زمانہ ابھی مہرباں اور ہے

جلا دیگی برقِ جہاں سوز کو
مری آہِ آتش فشاں اور ہے

عبث ہے دوائے جگر چارہ گر
تقاضائے حسنِ بتاں اور ہے

نہ ہوتی ہے مشکل کشا موت بھی
محبت میں جی کا زیاں اور ہے

تڑپتا نہ تھا یوں اسیرِ وفا
قفس میں کوئی امتحاں اور ہے

لبِ جوئے ساقیٔ مہوش کیسا تھا

بہارِ مے ارغواں اور ہے

سنے ہونگے قصّے بہت عشق کے

نظر کی مگر داستاں اور ہے"

مغنی یہ دیپک تھا کیا تیرا راگ
بدن میں لگا دی مرے جس نے آگ

مرا شعلۂ عشق بھڑکا دیا
مری روح کو اور تڑپا دیا

مجھے یاد آئے جوانی کے دن
جوانی کے دن زندگانی کے دن

وہ دن جب نہ تھا دل جفا آشنا
محبت کی دنیا سے نا آشنا

فریب وفا اُس نے کھائے نہ تھے
جفاؤں کے صدمے اٹھائے نہ تھے

نہ روتے تھے اس طرح مجھکو نصیب
نہ آیا غمِ جانستاں تھا قریب

نہ آنکھوں سے بہتا تھا سیلابِ خوں
نہ دیکھا تھا سامانِ جوشِ جنوں

تمنائیں رہتی تھیں ہر دم جواں
نہ ملتا تھا اس بے حسی کا نشاں

اٹھایا نہ تھا رنجِ دیوانگی
کہ دیکھا نہ تھا رنگِ بیگانگی

نہ مجبوریاں تھیں نہ رسوائیاں نہ شبہائے فرقت کی تنہائیاں

بسر بسکہ ہوتی تھی آرام سے
غرض تھی مے و ساقی و جام سے (اگست ۱۹۳۳ء)

سبو بھر کے ساقی پلانا مجھے گرا چاہتا ہوں اٹھانا مجھے
ترے سامنے درد و غم آئے کیوں مجھے یاد ماضی کی تڑپائے کیوں
نہیں ہے میسر جوانی تو کیا نہیں ہے جنوں کی نشانی تو کیا
جوانی کا دلکش ترانہ سہی جوانی کا رنگیں زمانہ سہی
جوانی کا ہر چند خوش کن ہے نام مگر ہے بھیانک جوانی کی شام
جوانی کا گو مختصر سا ہے دور نرالے ہیں لیکن جوانی کے طور
جوانی کے رہتے ہیں تازہ داغ جوانی سے بھرتا ہے غم کا ایاغ
جوانی کی باتیں جوانی کا جوش نہیں چھوڑتے زندگانی کا ہوش
جوانی میں انسان انسان نہیں جوانی کا ایمان ایماں نہیں

جوانی کی بربادیوں کا ثبوت — مری زندگی کا مسلسل سکوت
مگر یہ ستم اور کیسا ہوگیا — جواں سال ساقی خفا ہوگیا
غضب ہوگیا دیکھتے دیکھتے — بنا بُت خدا دیکھتے دیکھتے
نگاہوں کی شادابیاں لُٹ گئیں — زمانے کی آبادیاں لُٹ گئیں
نہیں خندۂ گل کا کچھ اعتبار — رہینِ خزاں ہوگئی ہے بہار
کرشمہ ہے ساقی یہ کس ذات کا — بنا جو تنبسّم مری بات کا
نہ یوں تلخ ہوتی کہانی مری — نظر میں تھی اپنی جوانی مری
ستایا ہوا ہوں جوانی کا میں — اسی گردشِ آسمانی کا میں
جوانی کی گو ہے شکایت مجھے — جوانی سے لیکن ہے الفت مجھے
میسّر جو ہوتی جوانی مجھے — رلاتی نہ یوں زندگانی مجھے
بگڑتا نہ ساقی مناتے نہ ہم — عبث ناز بے جا اٹھاتے نہ ہم
عبث ہے مگر ان کی سب برہمی — نہیں آجکل ساقیوں کی کمی

گیا وہ پرانا زمانہ گیا — سنا ہے جہاں نے فسانہ نیا

زمانے پہ چھائی ہے تہذیبِ نو — عجب رنگ لائی ہے تہذیبِ نو

نہیں اب کسی پر کسی کا مدار — اگر ایک روٹھے تو ساقی ہزار

محبت کے خواہاں ہیں سیمیں بدن — سکھاتے ہیں خود عشق بازی کے فن

حسینوں کو راس آ گئی دلبری — ہے ناز میں غرق عشوہ گری

بہت بڑھ گیا گرچہ معیارِ حسن — زمانہ ہوا ہے پرستارِ حسن

گئے دن کہ نغمہ سرائی تھا عیب — سرِ انجمن خود نمائی تھا عیب

نہ تھے بے حجاب اس طرح نازنیں — کہ سینہ نمودار گم آستیں

جہاں میں جو یوں انقلاب آ گیا — پھرا کیوں نہ واپس شباب آ گیا

مغنی بلا تو کہ گاؤں گا میں — منا کر جوانی کو لاؤں گا میں

بہت گردشِ آسمانی سہی

بہت حسن کی بدگمانی سہی

محبت میں رہتا ہے کس کا نشاں
مری موت تیری نشانی سہی

مئے زندگی میں سمِ غم بھی ہے
مئے زندگی ارغوانی سہی

ترا درد ہے میری کل کائنات
مرا عشق تیری کہانی سہی

مرے شوق کا حوصلہ الاماں
تمناؤں کی بے زبانی سہی

کیا کیا نظر زندگانی میں اور
خرابِ محبت جوانی سہی